اس ناول کے تمام جملہ حقوق مصنفہ کی ویبسائٹ کے لیے محفوظ ہیں۔اسے بنااجازت چھاپنے، کسی بھی ویبسائٹ پر پبلش کرنے، کسی سوشل میڈیا پلیٹ فارم یا یوٹیوب پر پبلش کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے۔

اپنی غلطیوں سے سیکھنے والوں کے نام۔۔۔

گر کے خود کو خود ہی اٹھانے والوں کے نام۔۔۔۔

بچھڑ کے پھر سے ملنے والوں کے نام۔۔۔۔۔

تقدیر پر شاکر رہنے والوں کے نام۔۔۔۔۔۔

ایک عام سے انسان کی تحریر

بہت ہی عام سے انسانوں کے نام۔۔۔۔

پیش لفظ

"نحل" میرا پہلا سلسلہ وار طویل ناول ہے۔ یہ ناول میں نے سن ۲۰۲۰ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر چھوڑ دیا، پھر لکھا اور دوبارہ چھوڑ دیا۔ دوسری بار جو وقفہ آیا وہ کافی لمبا تھا، قریباً تین سال کے طویل وقفے کے بعد میں نے دوبارہ وہیں سے اسے لکھنا شروع کیا جہاں پر چھوڑا تھا۔ اس وقت جب میں اس ناول کا پیش لفظ لکھ رہی ہوں، تو الحمد اللہ اسکے گیارہ باب مکمل ہو چکے ہیں۔ جنہیں صرف ترمیم کی ضرورت ہے۔ یہ گیارہ باب فقط آدھا ناول ہے۔ علاوہ ازیں یہ میرا وہ پہلا ناول ہے، جسکا باقاعدہ پلاٹ بنایا گیا۔ اُسکی تمام اقساط کا مکمل پلاٹ لکھنے کے بعد ہی میں نے اس ناول کو تحریری شکل میں لکھنا شروع کیا۔ پلاٹ لکھنے کا یہ تجربہ میرے لیے نہ صرف بہترین بلکہ بہت پر سکون کر دینے والا ثابت ہوا ہے۔

اب بات ہو جائے اسکے نام کی تو مجھے تھوڑا نہیں بلکہ پورا پورا یقین ہے کہ اس کے نام کی بدولت بہت سے لوگ اسے عموماً ناولز کی طرح اسلامی تفاسیر لیے کوئی ناول سمجھے گے۔ (معذرت لیکن ایسا ہی ہے)۔ نہ تو میں اپنے آپ کو تفسیر لکھنے کے اہل سمجھتی ہوں اور نہ ہی عام سے تخلیقی کرداروں کی کہانی کو اس قابل سمجھتی ہوں جہاں تفسیر جیسا اتنا بڑا کام کیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ، اسکا نام نحل کیوں رکھا گیا؟ نحل عربی میں شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ شہد کی ایک مکھی کا بظاہر کیا ہی کام ہو گا؟ دن بھر پھولوں کے رس اپنے منہ میں جمع کرنا اور اپنے مختص کیے گئے حصے میں وہ رس لا کر رکھ دینا۔ ہیں ناں؟ بظاہر یہ چھوٹا سا کام ہے لیکن اس کام کی ایک ایسی حقیقت بھی ہے جس سے ہم ناواقف ہیں۔ وہ یہ کہ شہد کی مکھیوں کی ایک ملکہ مکھی ہوتی ہے، وہ اپنے چھتے کے مختلف سوراخوں کو مختلف مکھیوں کو مختص کر دیتی ہیں۔ بلکل ایسے ہی جیسے ایک بلڈنگ میں مختلف فلیٹس یا اپارٹمنٹس مختلف رہائشیوں کو مختص کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر مکھی اپنے سوراخ کو پہچانتی ہے، اور وہیں اپنا رس لا کر جمع کرتی ہے۔ اگر کوئی مکھی واپس نہ آئے، مر جائے یا راستہ بھٹک جائے تو اُسکا کام ادھورا رہ جاتا ہے اور اُسکے حصے کا کام کوئی دوسری مکھی مکمل نہیں کرتی۔ اسی طرح پورا چھتہ ترتیب پاتا ہے۔

ذرا سوچیے، اگر ساری مکھیاں کام چھوڑ کر بیٹھ جائے تو چھتہ بن پائے گا؟ کبھی نہیں۔۔۔ نحل بھی ایک ایسی کہانی ہے۔ شہد کی مکھیوں کی طرح اس کہانی میں مختلف کردار ہیں، سب کی ایک داستان ہیں، سب کی اپنی اپنی تکلیفیں ہیں، اور سب کی اپنی اپنی جدوجہد ہیں۔ ان مختلف

کہانیوں سے مل کر ہی نحل ناول ترتیب پاتا ہے۔اس ناول میں آپکو ہر کردار اپنے حصے کی کہانی مکمل کرتا نظر آئے گا۔ کوئی دوسرا کردار کسی اور کردار کے حصے کی کہانی مکمل نہیں کر سکتا اور اگر اُسکی کہانی نامکمل رہ جائے تو ناول بھی نامکمل رہ جائے گا۔اسی مماثلت کی بناپر میں نے اس کا نام نحل رکھا ہے۔

اس کہانی کا کوئی ہیرو نہیں ہے، کوئی ہیروئن بھی نہیں ہے۔اس کہانی میں انسان بستے ہیں، بہت ہی عام سے انسان۔۔۔اس ناول کے کردار غیر ماروائی مخلوق نہیں ہیں جو ہر طرح سے پرفیکٹ ہوتے ہیں، غیر معمولی ذہین ہوتے ہیں اور ہر کام بہترین طریقے سے کرتے ہیں، ہر فیصلے صحیح لیتے ہیں، قربانی اور سمجھوتے کا پیکر ہوتے ہیں۔ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔اصل زندگی میں نہیں۔۔۔

لیکن نحل کے کردار عام سے ہیں، یہ غلطیاں کریں گے، اور بہت ہی فاش غلطیاں کریں گے۔ بعض جگہ قارئین اُنکی ان غلطیوں سے چڑ کر اُنہیں ناپسند بھی کرنے لگے گے۔ لیکن یہی حقیقت ہے، انسان غلطیاں کرتا ہے اور انہی سے سیکھتا ہے۔ بعض جگہوں پر یہ کردار جانتے بوجھتے غلط فیصلے لیتے نظر آئیں گے۔ باوجود اسکے کہ اُنکے سامنے ہی اُنکے فیصلوں کا نتیجے واضح ہو گا مگر وہ پھر بھی یہ غلط قدم اٹھائیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ ہم سب پورے ارادے کے ساتھ اور پورے ہوش و حواس میں غلط فیصلہ لیتے ہیں، اور پھر کتنے ہی عرصے پچھتاؤں اور شرمندگی کے دلدل میں دھنس کے گزار دیتے ہیں؟ بعض جگہ قارئین کو کوئی کردار پسند آنے لگے گا، لیکن اگلے ہی لمحے وہ بہت ہی کوئی خود غرضانہ فیصلہ لے کر اپنا سارا امیج خراب کر دیگا۔ آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ بھلا اتنا اچھا کردار، ایسا خود غرض کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن کیا ایسا نہیں ہوتا؟ ہم سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں کبھی نہ کبھی خود غرض بن کر نہیں سوچتے؟ ہم ایسا کرتے ہیں۔ ہم اپنا مفاد دیکھتے ہیں، اپنا فائدہ سوچتے ہیں اور کئی مرتبہ خود غرض بن جاتے ہیں۔

یہ ناول آپکو انسان کی نفساتی پیچیدگیوں میں اُلجھا نظر آئے آئیگا۔ کرداروں کی شخصیت غیر متوازن اور کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہوں گی۔ لیکن اُسکا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟ معاشرہ؟۔۔۔ ہر گز نہیں۔۔ ہم ہر شے معاشرے کے سر پر ڈال کر خود کو ہر الزام سے بری کر لیتے ہیں۔ جبکہ قصوروار ہم ہیں۔ معاشرہ بنتا ہے فرد سے، فرد بنتا ہے گھر سے، اور گھر بنتا ماں باپ سے۔ماں باپ یعنی میاں بیوی۔۔۔ اگر وہ آپس میں انسانوں جیسا رویّہ نہیں رکھیں گے تو وہ اچھے ماں باپ نہیں بن سکے گے، جب ماں باپ اچھی تربیت کرنے اور اچھا ماحول فراہم کرنے میں ناکام ہوں گے، تو گھر خراب ہو گا، گھر خراب ہو گا تو فرد خراب ہو گا اور فرد خراب ہو گا تو پورا معاشرہ بگاڑ کا سبب بنے گا۔ ہم اپنے

ساتھ پیش آنے والے برے واقعات، برے رویوں اور ناانصافی کا بدلہ عموماً دوسروں اور خصوصاً کمزور لوگوں سے لیتے ہیں۔ سو میں سے دو شخص ہی ایسے ہوتے ہیں جو جل کر کندن بن جاتے ہیں اور بہترین انسان بنتے ہیں۔ جیسا سلوک اپنے اوپر سہتے ہیں، ویسا دوسروں کے ساتھ نہیں ہونے دیتے، جن ٹراما سے خود گزرے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو منتقل نہیں کرتے۔ باقی اٹھانوے افراد وہیں ٹراما اپنے آس پاس کے لوگوں اور اپنی آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اور یہ سائیکل صدیوں چلتا ہے۔

نحل ایسے ہی لوگوں کی کہانی ہے، میری اور آپکی کہانی ہے، عام سے لوگوں کی کہانی ہے۔ ماضی، حال، مستقبل اور پھر ماضی کے گرداب میں پھنسی کرداروں کی داستان۔۔۔ آپ نے بس یہ دیکھنا ہے کہ آپ کندن بننے والوں میں ہیں یا اپنا معاشرہ بگاڑنے والوں میں شامل ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ اپنے آس پاس والوں کو کیا دے رہے ہیں۔ اچھے اخلاق یا مینٹل ٹراما؟

منجانب

ژیلہ ظفر

پہلا باب

مورخہ چھ

ہم وہ نہیں رہے جو کبھی تم کو یاد تھے

چہرے وہی رہے، دل مگر اجنبی سے ہیں

اک عمر کی تھکن ہے تعلق پہ چھائی ہوئی

باتیں وہی ہیں، لہجے مگر کچھ نم سے ہیں

جانے کہاں گئے وہ پرانے خیال سب

اب لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرے ہوئے سے ہیں

شاعر: مظفر وارثی

(ادبی حوالہ: مظفر وارثی کا شعری مجموعہ)

وقت کی گردش میں گم ہوئے لوگوں کو جب قسمت اکھٹا کرتی ہے تو وہ اتنے بدل چکے ہوتے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک، دوسرے کو اسکی ظاہری شخصیت کی وجہ سے پہچان ہی نہیں پاتا۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شخصیت کی اس تبدیلی سے وہ خود بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

----------+----------+-----------

''میرا خیال ہے کہ واپس چلتے ہیں کیونکہ یہ مقدم شفیق صاحب تو اب نہیں آنے والے'' علی کوئی پچاسویں مرتبہ اُسے کہہ چکا تھا، اور مسلسل پچاسویں مرتبہ عمر نے اُسے نظرانداز کیا تھا۔ یہ تو تہہ تھا کہ آج وہ مقدم شفیق سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔

وہ دونوں اسوقت جدید طرز کے بنے آفس کے ویٹنگ روم میں موجود تھے۔ ویٹنگ روم چاروں جانب سے شیشے کی دیواروں سے مزین تھا۔ شیشے کی دیوار سے باہر کام کرتے اسٹاف کو باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ ویٹنگ روم کے دائیں طرف بلکل اسی طرز کا شیشے کا آفس بنا تھا جو کہ مقدم شفیق کا تھا اور وہ اب تک نہیں پہنچا تھا۔ انکی آج اس سے میٹنگ تہہ تھی۔

''جو شخص دیئے گئے وقت سے پندرہ منٹ لیٹ ہو چکا ہے، اور اب تک اسکے آنے کے کوئی آثار نہ ہوں، اس سے کسی اچھے کام کی اُمید کیسے رکھ سکتے ہیں ہم؟'' علی کو یہ انتظار بہت کھل رہا تھا۔ وہ ویسے ہی وقت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتا تھا۔

''دیکھو ہم بہت جگہ سے دھوکہ کھانے کے بعد اور بہت سے لوگوں سے اس فرم کی تعریف سن کر ہی یہاں آئے ہیں، اب جس شخص کا کام اچھا ہوگا وہ تھوڑا بہت نخرے تو کریگا ہی'' اسکے مستقل احتجاج سے تنگ آکر عمر نے کہا تھا۔

''بہت ہی غیر منطقی بات ہے۔ اگر آپ وقت کے پابند ہی نہیں ہیں، تو آپکے کام کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے'' وہ سخت بیزار تھا

''سر مقدم ہمیشہ وقت کی پابندی کرتے ہیں اور وقت کی پابندی کرنے والے کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو اتنا انتظار نہیں کروایا ہے، صرف آج ہی ایسا ہوا ہے اور اس کی یقیناً کوئی وجہ ہو گی۔ باقی آپ پریشان نہ ہوں انہوں نے فون کرکے کہا ہے کہ وہ بس کچھ ہی دیر میں یہاں ہونگے۔ اسکے علاوہ انہوں نے آپ سے پیشگی معذرت بھی کی ہے'' پاس کھڑا ریسیپشنسٹ جو کافی دیر سے اُن دونوں کی گفتگو ملاحظہ کر رہا تھا، شائستگی سے بولا تو اُن دونوں نے شرمندگی سر ہلا دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کا اسٹاف نہ صرف اپنے باس کا احترام کرتا ہے بلکہ اس سے ایک دلی عقیدت بھی رکھتا ہے۔

''آہستہ بولو، ہم دونوں شاید کافی اونچی آواز میں بات کر رہے ہیں، اور کسی کے آفس میں بیٹھ کر اسی کی برائی کرنا بہت غیر اخلاقی حرکت ہے'' عمر نے اُسے احساس دلایا کہ وہ دونوں واقعی غیر مناسب گفتگو کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ علی کوئی جواب دیتا دونوں کی نظریں ایک ساتھ شیشے کی دیوار کے پار بنے اسٹاف روم پر پڑی، جسکے آخر میں آفس کا داخلی دروازہ تھا اور وہاں سے اس وقت فرم کا آؤنر داخل ہوا تھا، نیوی بلیو رنگ کی جینز پر گرے ہائی نیک اور اس پر گرے ہی رنگ کا کیجوال کوٹ پہنے، وہ مصروف سے انداز میں باآواز بلند سلام کرتا ہوا کسی کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ کیبن میں بیٹھے ایمپلائز نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اُسکے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ اسی مصروف سے

انداز میں اپنے آفس میں داخل ہو گیا تھا۔ چہرے سے بے نیازی چھلکتی تھی، چلنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ ابھی دنیا تسخیر لیگا، بلاشبہ وہ غضب کی شخصیت کا حامل تھا، وہ دونوں ساکت سے رہ گئے۔

''آپ دونوں بیٹھے، میں سر کو اطلاع دے کر آتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ دونوں کو مزید انتظار نہیں کروائیں گے'' ریسیپشنسٹ خوشدلی سے کہتا اسکے آفس کی جانب بڑھا تھا۔ یہ مقدم کی شخصیت کا رعب نہیں تھا، جس نے اُنہیں ساکت کیا تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ شناسائی، حیرت، بے یقینی جیسے جتنے الفاظ ہو سکتے ہیں، سب کے سب اس وقت اُن دونوں کے چہرے پر نظر آرہے تھے

''عمر یہ تو۔۔۔'' علی نے شیشے کی دیوار کے دائیں جانب نظر آتے آفس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن وہ بات مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید حیرت کی زیادتی کی وجہ سے۔

''یہ زندہ ہے؟'' عمر ایک یہی جملہ ادا کر سکا تھا۔ اپنے آفس میں بیٹھا مقدم، ریسیپشنسٹ کو کوئی ہدایت دے رہا تھا جواب میں وہ سر ہلا رہا تھا۔ پھر ریسیپشنسٹ دروازہ کھول کر ویٹنگ روم میں داخل ہوا

''سر، آپ دونوں میرے ساتھ آئے پلیز، اور انتظار کروانے کے لیے ایک بار پھر معذرت'' وہ اُنہیں اپنے پیچھے آنے کا کہہ رہا تھا۔ اُن دونوں نے بھی اپنے تاثرات نارمل کرنے کی کوشش کی اور اسکے پیچھے چلنے لگے لیکن جو جھٹکا اُنہیں ابھی ابھی ملا تھا اس سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔

----------+---------+----------

''السلام وعلیکم! بیٹھیے'' انکے آفس میں داخل ہوتے ہی مقدم شفیق اٹھ کر کھڑا ہوا اور دونوں سے ہاتھ ملانے کے بعد انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے تاثرات نارمل کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ناکام تھے۔ شہر کی فضا خطرناک حد تک خراب ہونے کی وجہ سے احتیاطی طور پر اُن دونوں نے چہرے پر ماسک لگایا ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ مقدم اُن کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا، اگر دیکھ سکتا تو یقیناً اس وقت حالات مختلف ہوتے۔ البتہ خود اس نے ایسی کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کی ہوئی تھی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے پہلے اسکے بولنے کا انتظار کر رہے تھے اور وہ اپنے سامنے رکھی اُن دونوں کی فائل پر سرسری سی نظر ڈال رہا تھا۔

''میرا نام مقدم شفیق ہے۔ میں یہاں کا اؤنر ہوں'' اس رسمی سے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا(**میرا نام آغا مقدم ہے۔ کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟**)ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے کی آواز انکے کانوں میں بھولی بھٹکی یاد بن کر گونجی تھی

''میں دیر سے آنے کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ دونوں سے آپکے نام نہیں پوچھوں گا۔ کیونکہ یہ ہماری فرم کی پالیسی ہے کہ ہم اپنے کلائنٹس کے نام نہیں پوچھتے صرف انکے کاروبار کی بنیادی معلومات لیتے ہیں، اور جب کوئی ڈیل تہہ ہو جاتی ہے تب ہم نام پوچھتے ہیں اور باقاعدہ قانونی کارروائی کے ساتھ اپنی سروسز دیتے ہیں۔ آپکے کاروبار کی معلومات میں نے کل پڑھ لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپکو کافی جگہوں سے دھوکہ اٹھانا پڑا ہے، میری طرح'' اس نے پیشہ ورانہ طریقے سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔(**معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ بھی یہاں کسی کو نہیں جانتے، میری طرح**)سولہ سال پہلے بھی تو انکے درمیان گفتگو کا آغاز ایسے ہی ہوا تھا۔

اپنے اصولوں کے مطابق اس نے اُن دونوں کا نام نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی انکی فائل میں اُنکا نام لکھوایا تھا۔ اُنہیں نہ پہچاننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی شاید۔

''تو آپ دونوں پہلے اپنا مسئلہ بیان کریں پھر جو بھی ہوگا وہ میں آپ دونوں کو بتادونگا'' اس نے اُنہیں بولنے کا موقع دیا تو سب سے پہلے علی نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا

''چونکہ آپ نے نام بتانے سے منع کیا ہے تو میں سیدھا اپنے کاروبار پر آتا ہوں۔ ہم دونوں نے دو سال قبل انٹیریئر ڈیزائننگ کا کام شروع کیا ہے، اور ہمارے پاس کافی زیادہ انٹیریئر ڈیزائنر موجود ہیں۔ پچھلے سال کی کلوسنگ کے دوران ہمیں اپنے کاروبار میں کافی زیادہ بے ذابتگیاں دیکھنے میں نظر آئی تھیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارا کونسا ایمپلوئی ہمارے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے۔ ہم نے انفرادی طور پر سال کے آخر میں آڈیٹر بلوایا لیکن اس نے کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ ہم مطمئن ہوگئے۔ لیکن اب اس سال کے آخر میں پھر ایسا ہوا ہے۔ اور ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ ہمارے کاروبار میں کہیں نہ کہیں کوئی غبن ضرور ہو رہا ہے۔ اسی لیے اس سال ہم نے دو مرتبہ آڈٹ کروایا ہے لیکن پھر بھی ہمیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا ہے کہ سب ٹھیک ہے، کوئی غبن نہیں ہوا'' اس نے تفصیل سے بتایا

''تو آپکو لگتا ہے کے جن آڈیٹرز کو اب تک آپ نے بلوایا ہے وہ آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیے جاتے ہیں؟ یعنی کوئی بہت ہی قریب کا شخص اپنے غبن چھپانے کے لیے آپکو دھوکہ دے رہا ہے'' اس نے پرسوچ انداز میں کہا

''جی ایسا ہی ہے، اب تک ہم نے جن لوگوں سے آڈٹ کروائی ہے وہ سب فریلانسر (بنا کسی کے زیر اثر کام کرنے والے) تھے۔ اب تنگ آکر ہم آپکی فرم کے پاس آئے ہیں'' علی نے جواب دیا۔ عمر بلکل خاموش تھا۔

''ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے پاس آئے ہیں لیکن سر، میں بے حد معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آپکے کسی کام نہیں آسکتے'' اس نے معذرت خوانا انداز میں کہا

''میری فرم میں باصلاحیت آڈیٹرز کی تقریباً بھی چار ٹیمز موجود ہیں۔ جو کہ مختلف پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیز کے آڈٹ کرتی ہیں، اور الحمدللہ ہم اس سال سے پبلک لمیٹڈ کمپنیز کے آڈٹ بھی کرنے جارہے ہیں۔ ایسے میں ہمارے پاس چھوٹے کاروباروں کیلئے آڈٹ کرنے کا وقت، بلکل نہیں ہے۔ اس وقت تو ویسے ہی ہر طرف کلوزنگ چل رہی ہے، تو ہماری کوئی بھی ٹیم اس وقت فارغ نہیں ہے۔ میں بہت معذرت چاہتا ہوں، لیکن ہم چھوٹے کاروباروں کے لیے آڈٹ نہیں کرتے''

''ہم یہ بات جانتے ہیں، آپ ہی کی طرح دو تین اور فرمز کے پاس گئے ہیں لیکن کوئی بھی چھوٹے کاروباروں کے لیے آڈٹ نہیں کرتا۔ آپ اگر کچھ کر سکے ہمارے لیے؟'' علی نے درخواست کی، اب وہ کافی پیشہ ورانہ طریقے سے بات کر رہا تھا البتہ عمر اب تک اس شدید شاک سے باہر نہیں آسکا تھا۔

''ہمارے کاروبار کے آڈٹ کے لیے کسی بڑی ٹیم کی ضرورت نہیں پڑے گی، آپ اپنا ایک بھی آڈیٹر بھیج دیں تو ہمارے لیے آپکا نام ہی بھروسے کے قابل ہے۔''

''دیکھیں جو کام ہم نہیں کر سکتے اسکے لیے حامی نہیں بھرتے'' اس نے کہا تو وہ مایوس ہوا

''آپ نہیں جانتے ہمارا کافی زیادہ نقصان ہو چکا ہے''

''چلیں میں کوشش کرونگا، اگر کچھ ہو سکا تو ضرور کرونگا۔ لیکن وعدہ نہیں کر رہا۔''

''کیا واقعی؟'' علی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مان گیا تھا۔

''اس بات کی تو میں گارنٹی دیتا ہوں کہ ہمارے آڈیٹر بلکل ہی غیر جانب دار ہو کر رپورٹ تیار کرتے ہیں۔اب چونکہ آپ اتنی درخواست کر رہے ہیں تو، میں وعدہ تو نہیں کر رہا پر میں کوشش ضرور کروں گا کہ اپنا کوئی آڈیٹر آپ کے پاس بھیج دوں''

''بہت مہربانی آپکی''

''آپ فکر نہ کریں، میں تین دن کے اندر ہی آپکے آفس کے نمبر پر اطلاع دے دونگا'' اس نے خوشدلی سے کہا

''ہمیں انتظار رہے گا'' علی نے کہا۔چپراسی چائے سامنے رکھ کر جا چکا تھا۔

''آپ لگتا ہے کہ زیادہ بات نہیں کرتے'' اس نے براہ راست عمر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔**(بہت کم بولتے ہو تُم، کبھی کبھی تو میں بور ہو جاتا ہوں تمہارے ساتھ)**

''نہیں ایسی بات نہیں ہے، بس آپ نے ہمارے لیے اتنا کر دیا بہت شکریہ۔میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے'' صاف ظاہر تھا، وہ وہاں مزید بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔اس نے دونوں سے کافی اچھے طریقے سے مصافحہ کیا اور جلد مطلع کرنے کا وعدہ کر کے اُنہیں رخصت کیا۔انکے جانے کے بعد وہ کافی دیر پر سوچ انداز میں بیٹھا رہا

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ اس دوسرے شخص کی آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے'' مقدم نے ذہن پر زور ڈالا پر اُسے یاد نہیں آ رہا تھا۔اس دوسرے شخص کی آنکھوں میں کچھ تھا جیسے وہ مقدم کو جانتا ہو۔

''وہ مجھے بار بار ایسے کیوں دیکھ رہا تھا؟'' علی سے باتوں کے دوران بھی وہ خود پر اُسکی شناسا نظریں محسوس کرتا رہا تھا، بہت دیر سوچنے کے بعد بھی جب کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تو وہ کندھے اچکا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

----------+---------+----------

''سی ٹی ڈی آفیسر نوید عالم؟'' سامنے والے نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''جی۔۔مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایئرپورٹ فورس نے چند مسافروں کے سامان میں سے بھاری مقدار میں منشیات برآمد کی ہیں۔مجھے اسی کی تفتیش کے لیے بھیجا گیا ہے'' اس نے ایئرپورٹ فورس کے آفیسر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں آفیسر فضل ہوں۔'' سامنے والے نے اپنا تعارف کروایا

''تواب تک کے کیا حالات ہے؟'' اس نے آس پاس سے گزرتے مسافروں پر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا

''اُن میں سے کافی مسافروں کا موقف ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ انکے سامان میں منشیات کیسے آئیں۔''

''جو سچ ہو گا وہ سامنے آجائے گا انشاءاللہ، ملزمان کہاں ہیں؟''

''اُنہیں تھوڑی دیر میں تفتیشی کمرے میں لایا جائے گا، تب تک کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔ زحمت کے لیے معذرت چاہتے ہیں''

''کوئی بات نہیں میں انتظار کر لونگا'' وہ کہتے ہوئے وہاں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ آفیسر فضل چلا گیا تھا۔

ایئرپورٹ پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے، کچھ کے چہروں پر آنے والوں کا انتظار تھا، تو کچھ غمگیں چہرے لیے جانے والے کو رخصت کر رہے تھے۔ کچھ بیزار سے بیٹھے فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ غرض ہر قسم کے لوگ اور بھانت بھانت کے بولیاں سنائی دے رہی تھی۔ وہ عادتاً ہر شخص کا معائنہ کرنے لگا، صرف ایک نظر دیکھنے پر ہی اسے پتہ چل جاتا تھا کہ کون مسافر ہے؟ کون اُسے رخصت کرنے کیلئے آیا ہے؟ یا اُسکا استقبال کرنے کیلئے؟ ایسے میں ایک منظر پر اسکی نظر ٹھہر سی گئی تھی۔

وہ تین لوگ تھے، ایک مرد، ایک عورت اور عورت کی گود میں غالباً ڈیڑھ-دو برس کی گول مول سی بچی تھی۔ اگرچہ وہ ایک مکمل فیملی تھی لیکن اس فریم میں کچھ نامکمل تھا۔ اگر وہ میاں بیوی تھے، تو اتنی دیر میں اُن دونوں نے ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی بات کی تھی نہ ہی نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے فاصلے رکھے کھڑے تھے۔

''ہو سکتا ہے یہ فیملی نہ ہو'' (ایک تو اُسکی غور وخوص کرنے کی عادت نہیں جاتی تھی). اس نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے نظروں کا رخ پھیرا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ چونکنے کے انداز میں دوبارہ اُسی جانب متوجہ ہوا۔ اور اُسی لمحے اسکی یاداشت نے اُسے یہ باور کروایا تھا کہ وہ صحیح تھا۔۔۔

وہ اُن دونوں کو جانتا تھا۔۔۔ بہت اچھے سے۔۔

----------+---------+----------

ظلم کا اگر کوئی دوسرا نام ہوتا تو وہ فاطمہ آفندی ہوتا۔

گھر میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا، بلکہ سنّاٹا کہنا زیادہ بہتر تھا، وحشت ناک سنّاٹا، یہ سنّاٹے کبھی کبھار اسکی جان لینے کے درپے ہو جاتے تھے۔

اور یہی اسکی زندگی تھی، روز کی طرح آج بھی اس خاموش گھر میں تین لوگ موجود تھے۔ ایک وہ اور دوسرا اُسکا باپ، لیکن وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو مخاطب تک کرنے کے روادار نہ تھے۔ تیسرا فرد اُسکا آٹھ سالہ بیٹا تھا جو فلحال دنیا اور اُسکے جھمیلوں سے انجان اپنی دنیا میں مگن رہنے والا ایک بے ضرر وجود تھا۔ روز کی طرح کچن میں کھڑے اپنے لیے چائے بناتے اور لاؤنج سے گزر کر اپنے باپ پر ایک لاتعلق سی نظر ڈال کر اپنے بیٹے کے کمرے میں جاتے ہوئے اُسے آج بھی فاطمہ یاد آئی تھی۔ فاطمہ۔۔۔ جو اسکی زندگی کا بدترین باب تھی۔ وہ جس نے اپنی موجودگی سے اسکی زندگی کا سکون حرام کیا تھا، اور وہ جس نے اپنی غیر موجودگی سے اسکی زندگی زہر آلود کر دی تھی۔ وہ جا کر بھی کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ بدترین یاد بن کر اسکے لاشعور میں ہمیشہ زندہ تھی۔

وہ فاطمہ جو اسکی بیوی تھی۔۔۔

وہ جو اپنی ہی اولاد کی قاتلہ تھی۔۔۔

----------+---------+----------

کلاس میں استاد موجود نہ ہو تو ہر طرف سماعتوں پر گراں گزرنے والا شور ہوتا ہے۔ ایسا شور جس میں کسی کو کسی کی بھی بات سمجھ نہیں آ رہی ہوتی، ایسا شور جیسے ساری باتیں بس ابھی اسی لمحے ہونگی ورنہ پھر کبھی نہیں ہو سکیں گی۔ ویسا ہی شور اس وقت وہاں بھی ہو رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی کلاس میں قدم رکھا اور روسٹرم کی طرف آیا پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ اس نے ایک نظر کلاس پر ڈالی، سب نو وارد تھے۔ ہر سال کے آغاز میں اُنہیں ایسے ہی نئے چہرے دیکھنے کو ملتے تھے، کچھ پریشان سے، کچھ نروس سے تو کچھ ایکسائٹڈ۔۔۔

''السلام و علیکم، میرا نام رضاالٰہی ہے۔ اور میں اس ڈیپارٹمنٹ میں مارکیٹنگ اور مینجمنٹ کا لیکچرر ہوں۔ آپکی کلاس کو میں **کمیونیکیشن سکلز** کا مضمون پڑھایا کرونگا۔'' اس نے ابتدائی تعارف کروانے کے بعد کلاس پر نظر ڈالی۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں سب ہی بہت شوق سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو ذہن میں کسی اُدھیڑ عمر ٹیچر کا خاکہ بنا کر آئے تھی۔ لیکن یہاں موجود جوان اور ہینڈسم سے ٹیچر دیکھ کر سب ہی خوش نظر آرہے تھے۔ وہ ہر سال طلباء وطالبات کی ایسی ہی پر شوق نگاہوں کا مرکز بنتا تھا۔ اسکے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔

''یہ مضمون بنیادی طور پر آپکو اخلاقیات، اور بات کرنے کے ادب و آداب سیکھانے کے لیے ہے۔ کسی سے بھی مخاطب کرتے ہوئے آپکی زبان، نظریں اور حرکات و سکنات کس طرح کی ہونی چاہیے۔ درحقیقت آپکو میں یہاں یہی سب کچھ سکھاؤنگا'' وہ پوری سنجیدگی سے کلاس کو اپنے مضمون کے بارے میں ابتدائی معلومات دے رہا تھا۔

اس نے بلیو جینز پر بلیو ہی شرٹ پہنے، اس پر خاکی رنگ کا جیکٹ ڈال رکھا تھا۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی جیسے مسکرانا تو اس نے کبھی سیکھا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ وہ بہت ہینڈسم اور بارُعب شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن، اسکی یہ ظاہری پرسنالٹی صرف دنیا دکھاوے کے لیے تھی۔ یہ سنجیدگی کا خول اس نے خود پر بہت عرصے سے چڑھا رکھا تھا۔

وہ اپنی حقیقت سے کسی کو واقف ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ حقیقت بہت تکلیف دینے والی تھی۔

----------+---------+----------

عمر نے بنا کچھ کہے اپنے دونوں ہاتھ اسکی جانب بڑھا دیے۔ عمارہ نے ایک نظر اسکے ہاتھوں کو دیکھا پھر گود میں تھامی اپنی پونے دو سال کی بیٹی کو اسکے حوالے کیا۔ عمر نے اُسے گود میں لیتے ہی بے تابی سے گلے لگایا، بے تابی یا شاید بے بسی۔۔۔ وہ بچی کے دونوں گال چوم رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اس سے آخری بار مل رہا ہو۔

''عمائمہ، بابا کو یاد کرو گی نا؟'' اس نے اپنی گود میں موجود بچی سے پوچھا تو اس نے بس سر ہلایا اور آنکھیں کھولے اُسے دیکھے گئی۔ اس نے بچی کو پھر سے خود میں بھینچ لیا۔ اس سارے منظر نامے میں بچی کی ماں عمارہ اپنا ہینڈ کیری لیے لاتعلق سی کھڑی تھی۔ ایک نگاہ غلط بھی اُن پر

ڈالنا گوارا نہ کیا تھا۔ پیچھے فلائٹ کی اناؤنسمینٹ ہو رہی تھی۔ اُنہیں بورڈنگ کے لیے جانا تھا۔ اس نے آخری بار بچی کو پیار کیا اور اُسے اسکی ماں کے حوالے کیا۔

عمارہ ایک ہاتھ میں بچی کو لیے دوسرے ہاتھ سے ہینڈ کیری گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ وہ اُس سے دور ہو رہی تھی۔ اسکے کندھوں سے لگی عمائمہ پیچھے کھڑے اپنے باپ کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ عمر نے اُسے ہاتھ ہلایا۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگی۔ پتہ نہیں کب وہ اُسے دوبارہ ملے گا؟ تب تک وہ کتنی بڑی ہو چکی ہو گی؟ اُسے وہ یاد بھی رہے گا یا نہیں؟ بلکہ وہ کبھی دوبارہ اس سے مل بھی سکے گا؟

آنسو باہر آنا چاہتے تھے لیکن وہ اُنہیں آنے نہیں دے رہا تھا۔ اُسے اُنہیں روکنا تھا، اُسے ہمیشہ آنسو روکنا ہی سکھایا گیا تھا۔ وہ مرد تھا، اُسے رونا نہیں سکھایا گیا تھا، اُسے کبھی رونے کی اجازت ہی نہیں دی گئی تھی۔ اُسے روتا دیکھ کبھی تسلی کے الفاظ نہیں کہے جاتے تھے بلکہ شرمندہ کیا جاتا تھا کہ ''مرد ہو کر روتے ہو؟''۔ اُسے اپنا دل ہلکا کرنے کی اجازت نہ تھی، اُسے صرف کڑھنا تھا، اپنے اندر ہی گھل گھل کر ختم ہونا تھا کہ وہ **"مرد"** تھا۔

بھلا مرد بھی روتا ہے؟

اس سے پہلے کہ اس کا بھرم ٹوٹ جاتا۔ وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔ اُسے جاتا دیکھ، بورڈنگ کے لیے لائن میں لگی عمارہ کی گود میں موجود بچی تقریباً چیخ پڑی۔

''مما۔۔ بابا جا رہے ہیں، مما! بابا جا رہے ہیں۔ مما۔۔۔ مما۔۔'' وہ اپنی ماں کو زور زور سے اپنے باپ کے پلٹ جانے کی اطلاع دے رہی تھی لیکن جواب ندارد تھا۔

''مما! بابا جا رہے ہیں'' پھر بھی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے وہ اپنے باپ کو جاتا دیکھ رہی تھی۔

''مما! بابا چلے گئے۔۔۔ بابا چلے گئے'' وہ اب مایوسی سے کہہ رہی تھی۔ بورڈنگ پاس کے لیے اسٹاف کو اپنا شناختی کارڈ پکڑاتی اسکی ماں نے ایک نظر مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ ایک نظر دھندلا گئی تھی، آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ سرخ آنکھوں سے اُسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

وہ عورت تھی، رو سکتی تھی

اُسے رونا ہی تو سکھایا گیا تھا۔۔۔

----------+---------+----------

وہ جس راستے پر کھڑا تھا، اُسکے دائیں جانب کھائی اور بائیں جانب چٹان تھی۔ وہ کوئی وادی تھی۔ آنکھوں کو خیراں کر دینے والا قدرتی حسن شاید دنیا کو بھلا معلوم ہوتا ہو لیکن اُسے، اس وقت خوفزدہ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ایک گاڑی اُسے اپنی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دی، گاڑی کی کھڑکی سے ایک لڑکی نے جھانک کر اسکی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

وہ اس لڑکی کو وہیں روکنا چاہتا تھا، اُسے کہنا چاہتا تھا کہ آگے نہ بڑھے۔ لیکن اسکی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آواز گلے میں ہی کہیں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ ہر بار اُسے روکنا چاہتا تھا پر روک نہیں پاتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ گاڑی اپنا توازن کھونے لگی، وہ اس سے اگلا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے آنکھیں بند کرنی چاہی۔ لیکن یہاں بھی اُسکا بس نہیں چل سکا۔ آنکھیں بند ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں، یا شاید وہ بند آنکھوں سے بھی یہ منظر دیکھ سکتا تھا، پوری جزئیات کے ساتھ۔۔۔۔

گاڑی اپنا توازن کھوتے ہوئے پلک جھپکتے ہی کھائی میں جا گری تھی۔ اور ٹھیک اسی لمحے اسکی آواز واپس آئی تھی۔ وہ پوری شدت سے چیخا تھا ''لیلیٰ۔۔۔'' مقدّم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ رات کا شاید تیسرا پہر تھا، اُسکا تنفس تیز چل رہا تھا جبکہ دل لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ اس نے آج پھر وہی خواب دیکھا تھا۔

یہ خواب اُسے پوری طرح یاد ہو چکا تھا حتیٰ کہ وہ خواب کے اندر بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ آگے جو ہونے والا ہے وہ اُسے پہلے سے معلوم ہے۔ کچھ دیر اپنا سانس بحال کرنے کے بعد اُس نے اپنے برابر میں سوئے مکرّم کو دیکھا تھا۔ اُسکے چیخنے پر بھی وہ نہیں اٹھا تھا۔

مکرّم اس کا دو سال کا بیٹا تھا۔ وہ بچہ نیند کا پکا تھا جو کہ عموماً اس عمر کے بچے نہیں ہوتے۔ اس نے پیار سے بچے کے سر پے ہاتھ پھیرا۔ اپنے اس بچے کے لیے اُس نے دنیا زمانے سے رشتے ختم کر دیئے تھے۔

کوئی اُسے گمشدہ خیال کرتا تھا تو کچھ نے اُسے مردہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اُسکے لیے سب بے معنی ہو چکے تھے۔

----------+---------+----------

''وہ بھاگ رہی ہے۔۔۔۔ پکڑو اُسے۔۔۔۔ گاڑیاں نکالو وہ بھاگ نہ جائے۔۔۔'' اُسکے سابقہ شوہر کے حوارین چلا چلا کر سب کو مطلع کر رہے تھے۔ رات کے اس وقت اُس ولا میں کہرام مچ گیا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو لیکر بھاگ رہی تھی۔ نہ راستے کا پتہ نہ منزل کا تعین، بس پرواہ تھی تو یہ کہ اپنی بیٹی کی جان بچانی ہے، یا جان دے دینی ہے۔

''امی پاؤں میں درد ہو رہا ہے'' اُسکی تین سالہ بیٹی نے کراہتے ہو کہا

''بس تھوڑی دیر بیٹا''

''نہیں میں اور نہیں بھاگوں گی'' اُسکی بیٹی نے اُسکا ہاتھ چھوڑا۔ اُس نے رک کر اپنی بچی کو دیکھا۔ وہ واقعے اتنا نہیں بھاگ سکتی تھی۔ پھر اُس نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھایا۔ اُن کے تعاقب میں آنے والوں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔

اُس نے بچی کو لیکر دوڑنا شروع کر دیا، کافی دیر چھپتے چھپاتے وہ بلآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں خانہ بدوشوں کی پوری خیمہ بستی تھی۔ اُس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اور اُس بستی میں جا گھسی۔ کچھ دیر وہ ایک پرانی چادروں سے بنے خیمے کی آڑ میں بیٹھی رہی، اُسکے تعاقب میں آنے والے آگے چلے گئے تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔

''کون ہو تم؟'' ابھی وہ سکون سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ کسی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟ دیکھنے میں تو کسی اچھے خاندان کی ہو۔۔۔ کس سے بھاگ کر اس گندی بستی میں آئی ہو؟'' بوڑھی عورت نے پے در پے سوالات کیے تھے۔

''میں مجبور ہوں، میری مدد کرو۔ وہ میری بیٹی کو مار دینگے۔'' اُس نے روتے ہوئے کہا

''کون مار دینگے؟'' بوڑھی عورت اُسکے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''وہ۔۔۔ میرا شوہر۔۔۔ اور اُسکے آدمی۔ وہ میری بیٹی کو امیر آدمی کو بیچنا چاہتے ہیں۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔ یا تو وہ اسے بیچ دینگے یا مار دینگے''

''میں تو سمجھتی تھیں کہ یہ قباحتیں ہم غریبوں میں ہی ہیں، لیکن امیر بھی انہی گندگی کا حصہ ہیں؟ خیر تم فکر نہ کرو۔ یہاں چھپی رہو، جب تک تمہیں اُسکا خوف ہے، آگے میرا خیمہ ہے۔ میرے ساتھ میری پوتی ہوتی ہے'' وہ کھڑی ہوئی اور ان دونوں ماں بیٹی کو پیچھے آنے کہا

''ہم دونوں گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔ لیکن تم پریشان نہ ہو۔ آنے والا اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔'' بوڑھی عورت اُسکے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مختلف خیموں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ اُسے ایک پرانے گندے سے خیمے میں لے آئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اُس نے خیمے کے رک رکھ کر اس لڑکی سے پوچھا

''فاطمہ۔۔۔ فاطمہ آفندی''

----------+---------+----------

''سر۔۔ آفس کے نمبر پر کال آئی تھی'' وہ علی کے ساتھ اپنے آفس میں بیٹھا تھا، جب اسکے سیکریٹری نے اُسے آکر اطلاع دی

''کس کی کال تھی؟'' علی نے پوچھا

''مقدم شفیق کے منیجر کی کال تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تین بندوں پر مشتمل ٹیم بھیج رہے ہیں آڈٹ کے لیے، وہ کل آئینگے۔ اسکے علاوہ اُنکا لیگل ایڈوائزر بھی ساتھ ہوگا، وہی تمام قانونی کارروائی کریگا'' اس نے تفصیل سے بتایا تو اُن دونوں نے ہی سکھ کا سانس لیا تھا، جیسے سر سے بھاری بوجھ ہٹا ہو۔

''ٹھیک ہے، تُم جاؤ'' علی نے اُسے اشارہ کیا

''چلو شکر، وہ مان تو گیا ورنہ مجھے لگا تھا کہ اُس نے تکلفاً حامی بھری ہے'' علی نے کچھ پیپرز دیکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

''جو کام وہ نہیں کر سکتا اسکے لیے وہ کبھی حامی نہیں بھرتا، تکلفاً بھی نہیں۔۔۔ تُم جانتے تو ہو اسے'' عمر کے لہجے میں کچھ تھا۔ علی نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا

''ہاں یہ تو ہے، وہ یقیناً اتنی گنجائش نکال سکتا ہوگا، تبھی اس نے حامی بھری ہوگی، ورنہ اُس نے کونسا ہمیں پہچان لیا تھا''

''میں حیران ہوں کہ وہ بنا بتائے، بلکل اچانک سے کہاں چلا گیا تھا؟اور پھر یوں اچانک سے ہمارے سامنے آ گیا''عمر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا

''ہمم۔۔لیکن میں حیران نہیں ہوں''

''تمہیں کیا لگتا ہے اس نے ایسا کیوں کیا ہو گا؟''وہ مکمل طور پر اسکی جانب متوجہ تھا

''تُم جانتے ہو کہ میں کسی کے بھی ذاتی مسئلوں میں نہیں پڑتا اور نہ ہی اس بارے میں سوچتا ہوں۔اور رہی بات اسکے اچانک سے واپس آنے کی تو میں بلکل حیران نہیں ہوں''

''پر کیوں؟''عمر نے اُسکے لہجے پر غور نہیں کیا

''کیونکہ میں نے تمہیں بھی ایسے ہی پس منظر سے غائب ہوتے دیکھا ہے۔اور پھر چھ سال بعد اچانک واپس آتے بھی، لیکن کیا میں نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟''علی نے سوال کافی سنجیدگی سے کیا تھا۔عمر ساکت رہ گیا تھا۔آج اتنے عرصے میں پہلی بار کسی نے اِسے، اُس بات کا طعنہ مارا تھا۔جو اُسکے خیال میں سب بھول چکے تھے۔

''میں اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔تُم بھی ہو جاؤ''وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔

گزشتہ دو سالوں میں پہلی بار اُن دونوں نے آفس کے کام کے علاوہ ذاتی نوعیت پر کوئی بات کی تھی۔ورنہ وہ کام کے علاوہ کسی بھی موضوع پر بات کرتے لیکن کبھی بھی ذاتی قسم کے سوالات نہ کرتے تھے۔یہ انکے درمیان جیسے خاموش معاہدہ تھا۔

اور اس خاموش معاہدے کو آج ایک پرانے واقف کار نے توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

----------+----------+----------

''کیا مطلب امی؟اُنکا بیٹا۔۔نہ اُسکی تعلیم ہے،نہ شخصیت اور تو اور وہ گٹکا کھاتا ہے۔آپ کیسے ایسے لوگوں کو میرے لیے گھر بلا سکتی ہیں؟''وہ سخت طیش کے عالم میں چلا رہی تھی، لیکن اُسکی ماں کو مطلق پرواہ نہ تھی۔وہ ہمیشہ ایسے ہی شور شرابا کرتی لیکن اُسکی ماں کے پاس ہزاروں جواز ہوتے تھے،اُسے چپ کروانے کو

''مرد کی شکل اور تعلیم کون دیکھتا ہے؟ اور گٹکا ہی کھاتا ہے نہ۔۔۔ شراب تو نہیں پیتا۔ تم جب اُسکی بیوی بنو تو چھڑوا دینا'' اُسکی ماں نے اطمینان سے کہا

''میں اُسکی بیوی بنو ہی کیوں؟'' وہ چیخی

''بس بہت ہوا۔۔۔ میں کونسا تمہاری شادی کروا رہی ہوں، بس ملنے کہا ہے۔ اب گھر آنے والوں کو منع کر دوں؟''

''بعد میں بھی منع ہی کرنا ہے تو ابھی کریں۔۔ جب ہاں نہیں کرنی ہے تو میں کیوں تیار ہو کر اُنکے سامنے بیٹھوں؟''

''خاموش رہو۔۔۔ وہ مجھ سے بات کر چکے تھے فون پر۔۔۔ اب کیسے منع کر دوں کہ نہ آئے؟''

''نہیں۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ آپکے ذہن میں کہیں نہ کہیں اقرار ہے، جب ہی آپ منع نہیں کر رہی۔۔۔ آپ کیسے اپنی بیٹی کے لیے ایسی شخصیت کے حامل انسان کو سوچ سکتی ہیں؟'' وہ رو دینے کو تھی۔۔۔ آگے سے اُسکی ماں کچھ کہہ رہی تھی لیکن وہ آنکھوں میں آنسوں لیے چپ بیٹھی تھی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔

اور کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ تیار ہوئی کچھ آنٹی نما عورتوں کے سامنے بیٹھی تھی، جو سر سے پاؤں تک اُسکا ایکس سرے کر رہی تھیں۔ بات بات پر اپنے مہنگے گھر اور پیسوں کی زبانی نمائش جاری تھی۔

''میری بیٹی الحمدللہ بہت سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے'' اُسکی ماں نے بات شروع کی

''بہن پڑھائی لکھائی کا کیا کرنا۔۔۔ آپ نے فضول میں اتنا پڑھایا لڑکی کو۔ ہم تو کبھی نہ آتے کسی پڑھی لکھی لڑکی کا رشتا لیکر، ویسے ہی اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں'' لڑکے کی ماں نے کہا

''تو پھر کیوں آئیں آپ؟'' اب کہ اُسکی ماں کو بھی برا لگا

''بھئی سمجھا کریں ہمیں بھی ایسی چاہیے، جو زبان دراز نہ ہو۔ سے جھکا کے ہماری ہر بات سنے'' اُنہوں نے بات گھمائی

''ابھی آپ نے کہا کہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں چاہیے، کیونکہ اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔اب آپ کہہ رہی ہیں کہ سے جھکا کر ہر بات مانے گی۔آپ کہنا کیاچاہ رہی ہیں؟میں سمجھ نہیں پائی'' اُسکی ماں نے کہا

''ارے بیشک پڑھی لکھی ہے لیکن ہے تو کالی نہ۔۔۔رنگ گورا ہوتا تو پھر تو میرے بیٹے کو غلام ہی بنالیتی،بس اسی وجہ سے آئے ہیں۔ہمیں بھابھی ایسی چاہیے جو بھائی کو مُٹھی میں نہ کرے'' لڑکے کی بہن ظالمانہ حد تک صاف گو تھی۔اُس نے شاک کی کیفیت میں اپنی ماں کو دیکھا جواب بغلے جھانک رہی تھیں۔

''رشتے والی بتارہی تھی کہ رنگ کالا ہونے کی وجہ سے آپکی بیٹی کا رشتہ نہیں ہوا اب تک، عمر بھی پچیس چھبیس سال ہے۔اب ہم تو اللہ کی خاطر آئے ہیں کہ کسی کا بھلا ہو جائے ورنہ ہمارے بیٹے کو کونسی کمی ہے؟اب آپکی بیٹی کا رنگ کم ہے تو آپکو اُسکی شادی کروانے کے لئے کچھ دینا دلانا۔۔۔'' لڑکے کی ماں ہمدردی کے لبادے میں چھپا کر وہی باتیں کر رہی تھی جو باقی لوگ بھی یہاں سے کر کے جاتے ہیں۔

وہ اٹھی اور اپنی ماں اور مہمانوں کی سامنے سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔روتے ہوئے۔۔۔سسکتے ہوئے۔۔۔پیچھے اُسکی ماں اب کیا کہہ رہی تھی اُسے پرواہ نہ تھی۔دماغ میں بس ایک ہی لفظ تھا

''کالی''

----------+---------+----------

''اف۔۔۔'' اس نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکایا تھا۔آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔پچھلے ماہ ایئرپورٹ پر کچھ مسافروں کے سامان سے نکلنے والی منشیات کی وجہ سے اُسے مسافروں سے تفتیش کے لیے بھیجا گیا تھا۔تفتیش کے ذریعے کچھ اسمگلرز کی نشان دہی ہوئی تھی۔کافی محنت کے بعد جب وہ اُن اسمگلرز کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے تو ایک نیا کیس انکے سامنے آیا۔جن لوگوں کو وہ چھوٹا موٹا اسمگلر سمجھ رہے تھے، وہ پوری ایک گینگ تھی۔ایک ایسی گینگ جو منشیات کے ساتھ ساتھ انسانی اسمگلنگ بھی بڑے پیمانے پر کرتی تھی، زندہ انسانوں سے لے کر مردہ انسان اور انکے عضو تک بیچے اور خریدے جاتے تھے۔اسکے علاوہ ذاتی دشمنی کے لیے آپ اُن سے کرائے کے قاتل بھی لے سکتے تھے۔وہ پورا بزنس تھا۔

یہ کاروبار کون چلا رہا تھا؟اسکے کتنے مالک تھے ؟اور وہ کس ملک میں تھے یہ سب انکی پہنچ سے باہر تھا۔ حتٰی کہ اُن گرفتار کیے گئے اسمگلرز کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کسی گینگ کے لیے کام کر رہے ہیں۔اُن میں سے ہر ایک نے یہی بتایا کہ اُنہیں ایک ''فرمان''نامی شخص نے یہ کام سونپا تھا۔اُسکا نمبر، نام، پتہ کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ شخص اُن سے مختلف جگہوں پر ملا تھا۔

اُن جگہوں سے اُسکا ڈیٹا نکلوانا، سی سی ٹی وی فوٹیج نکلوانا بہت صبر آزما کام تھا۔

پورے ماہ کی محنت اور شدید بھاگ دوڑ کے بعد وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو سکے تھے، کہ وہ شخص جس کا نام فرمان تھا وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔اور در حقیقت اُسکا نام فرمان بھی نہ تھا بلکہ ''مائیکل'' تھا۔ وہ اپنی جھوٹی شناخت کے ساتھ اُن سے ملا تھا، وہ اسکے بے حد نزدیک پہنچ چکے تھے۔آج اُنہیں اُسے گرفتار کرنے جانا تھا لیکن۔۔۔

بد قسمتی سے وہ فرار ہو گیا۔البتہ انہوں نے ہوٹل میں موجود اُسکا سامان اور دیگر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سارے دِن کی مشقت میں اُسے ایک پل بھی بیٹھنے کا وقت میسر نہ ہوا تھا۔

"تو اتنے ماہ کی محنت بیکار چلی گی ؟"اس نے دل میں سوچا۔

''اس مائیکل عرف فرمان کے سامان سے بھی کوئی قابل ذکر چیز نہیں مل سکی ہے۔ ہم کہاں سے پکڑیں گے اُس گینگ کو''اس نے پریشانی سے ماتھا مسلا تھا۔تب ہی اسکے کمرے کا دروازہ کھلا اور اُسکا جونیئر اندر داخل ہوا۔اس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا

''سر! میں ایک بار پھر مائیکل کے سامان کی تلاشی لے رہا تھا تو جس بیگ کو ہم نے خالی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مجھے اس بیگ سے کچھ ملا ہے''اس نے بتایا۔

''ہاں! مجھے یاد ہے کہ میں نے مائیکل کا بیگ خود چیک کیا تھا اس میں ایسی کوئی قابل ذکر چیز نہ تھی''

''سر! مجھے اُسی بیگ سے یہ فائل ملی ہے''اس نے ایک لال رنگ کی پتلی سی ڈائری اُسکی جانب بڑھائی جسے اس نے شدید حیرت کے عالم میں تھاما تھا

''پر ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟میں نے تلاشی لینے کے بعد خود خالی بیگ وہاں رکھا تھا''

''سر! بیگ بظاہر خالی لگتا تھا لیکن میں نے جب اُسے ہاتھ لگایا، تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھاری ہے۔ میں نے بیگ کے اندر موجود کپڑا کاٹا تو مجھے اس کپڑے کے نیچے سے یہ ڈائری ملی ہے''

''ویلڈن شیراز! بہت اچھا کام کیا ہے تُم نے، اگر مائیکل نے یہ ڈائری چھپا کر رکھی تھی تو یقیناً یہ اہم ہو گئی'' اس نے اندازہ لگاتے ہوئے ڈائری کھولی اور اگلے ہی لمحے وہ اور شیراز سن رہ گئے تھے۔

وہاں ہر پیج پر قریباً بھی بارہ مختلف لوگوں کی تصاویر تھیں۔ کچھ تصویریں مردہ اشخاص کی تھیں تو کچھ زندہ اور مسکراتے چہرے بھی تھے۔ لیکن جس بات نے اُنہیں سن کیا تھا وہ اُن تصویروں پر لال رنگ سے لگایا گیا کراس کا نشان تھا۔ ہر تصویر کے نیچے الگ الگ ماہ کی کوئی ایک تاریخ واضح کی گئی تھی۔

''یہ کیا ہے سر؟''

''دیکھنے میں تو یہ سیریل کلر لگتا ہے، تصویروں اور اُن پر واضع کی گئی تاریخوں سے لگتا ہے کہ ان سب کو انہی تاریخوں میں مارا گیا ہے۔'' اس کا تجربہ تو یہی کہتا تھا۔ وہ مختلف پیجز آگے بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔ ہر تصویر کے ساتھ ایک مہینہ اور ہر صفحے کے ساتھ ساتھ ایک سال بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے پہلے صفحے پر دس سال پہلے کی تاریخیں تھیں۔ اگلے پر نو سال پہلے کی اور اس سے آگے آٹھ سال اور اسی طرح ہر صفحے پر نیا سال ہوتا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے یہ مہینے میں ایک یعنی ہر سال بارہ بندوں کا قتل کرتا ہے۔ اور انکی تصویریں یہاں جمع کرتا ہے''

''پر مارنے والا انکی تصویریں اپنے پاس کیوں رکھتا ہے؟''

''سائیکوپیتھ۔۔۔ یہ جو لوگ ماس کلر یا سیریل کلر ہوتے ہیں۔ انکے پاس عموماً اسی طرح کی تصاویر پائی جاتی ہیں۔ خیر تُم یہ ڈائری لے کر جاؤ اور اس میں موجود تمام لوگوں کی معلومات لے کر آؤ۔ وہ کیسے مرے، کب مرے؟ عدالت میں انکی موت پر کوئی کیس کیا گیا یا نہیں، ساری معلومات لا کر دو مجھے''

''اوکے سر'' وہ ڈائری لے کر باہر چلا گیا۔ اسکے جانے کے بعد وہ پھر سے پریشان سا بیٹھ گیا تھا۔ یہ کیس جتنا آگے بڑھ رہا تھا، اتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ تلاش وہ اسمگلر کو کر رہے تھے اور پتہ نہیں کیا کیا انکے سامنے آتا جا رہا تھا۔

شیراز کو گئے آدھے گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے، کہ وہ دوبارہ واپس آیا۔

''دونٹ ٹیل می کہ تُم نے آدھے گھنٹے میں ہی معلومات اکھٹی کر لی ہیں'' شیراز کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ اُس سے پہلے ہی بول پڑا۔

''نہیں سر! معلومات ابھی مکمل نہیں ہوئی، مگر اس ڈائری میں کچھ ایسا ہے جو آپکو ضرور دیکھنا چاہیے''

''دکھاؤ'' اس نے ڈائری اُسکے ہاتھ سے لی اور دوبارہ کھولی

''آخری صفحہ سر۔۔۔'' شیراز کی نشان دہی پر اس نے آخری صفحہ کھولا۔ اور اگلے لمحے ڈائری اسکے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی، وہ بے یقینی سے کبھی ڈائری کو، تو کبھی اپنے سامنے پریشان سے کھڑے شیراز کو دیکھتا تھا۔ اس وقت اُسکا چہرہ کوئی دیکھ لیتا تو شاید مردہ خیال کر بیٹھتا۔ لگتا تھا جیسے سارا خون خشک ہو گیا ہو۔

آخری صفحے پر کل چھ تصاویر تھیں۔

سب کی سب قریباً بھی دس سال پہلے کی تھیں۔ اُن چھّ تصویروں پر کسی قسم کا کوئی مارک نہیں تھا۔ کسی قسم کی کوئی کراس کا نشان بھی نہیں لگایا گیا تھا۔

وہ اُن تصویروں میں موجود پانچوں لوگوں کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ بلاشبہ پچھلے دس سالوں سے وہ اُن میں سے کسی سے بھی رابطے میں نہیں تھا۔ لیکن وہ اُن پانچوں کو بہت اچھے سے جانتا تھا۔

اور رہی بات چھٹی تصویر کی۔۔۔ تو چھٹی تصویر اسکی خود کی تھی۔۔ وہ یعنی **"سی ٹی ڈی آفیسر ایس ایس پی نوید عالم"**

اس ڈائری کے آخری صفحے نے اُسے بتایا تھا کہ وہ چھ لوگ موت کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

----------+----------+----------

''چھ لوگ، سال کا چھٹا مہینہ اور مورخہ چھ''

ڈی آئی جی فرّخ کے سامنے وہی ڈائری اور وہی صفحہ کھلا رکھا تھا جس نے ایک ہی رات میں انکی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

''سر! یہ تاریخ جولائی کی ہے، اور آج نئے سال کی پہلی رات شروع ہو چکی ہے۔ یعنی ہمارے پاس چھ ماہ ہے۔'' نوید نے چھ تصاویر کے نیچے واضح کی گئی تاریخ کے متعلق کہا۔

''پھر سے چھ؟'' ڈی آئی جی صاحب نے پُر سوچ انداز میں کہا

''جی سر، دیکھنے میں یہ کسی گیم جیسا لگتا ہے۔ جہاں ہر چیز کی تعداد چھ رکھی گئی ہے''

''لیکن میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں''

''وہ کیا سر؟''

''فائل میں لکھی گئی سابقہ تاریخوں کے حساب سے، اس مائیکل عرف فرمان نامی شخص نے اب تک ایک تاریخ میں ایک ہی شخص کا قتل کیا ہے۔ جو کہ پورے سال میں بارہ قتل بنتے ہیں لیکن اس آخری صفحے پر موجود چھ افراد کی تصاویر کے نیچے ایک ہی دن کی تاریخ ہے۔ اسکا مطلب کہ یہ ان چھ بندوں کو ایک ہی وقت یا ایک ہی دن میں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے''

''یعنی؟''

''یعنی وہ اپنا پہلا **ماس مرڈر** پلین کر رہا ہے'' انہوں نے آہستہ لہجے میں کہا۔ نوید کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

''لیکن سر! کسی کو قتل کرنے کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے؟ پہلے ہم اسے اسمگلر سمجھ رہے تھے، پھر وہ سیریل کلر نکلا اب وہ اپنا پہلا **ماس مرڈر** پلین کر رہا ہے۔ آخر یہ کس قسم کا کھیل ہے۔ یہ ہے کون؟ اور اسکی شاخیں کہاں تک ہیں؟'' وہ شدید اضطراب کے عالم میں بولا تھا

''وجہ نوید۔۔۔ وجہ۔۔۔ یہی وجہ تو تلاش کرنی ہے ہمیں، اور مورخہ چھ سے پہلے'' ڈی جی صاحب نے کہا تو اس نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''اس تصویر میں موجود بقیہ پانچ لوگوں کو تُم جانتے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا

''تو اُن سے رابطہ کرو، سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ انکی کسی سے کوئی دشمنی ہے؟''

''سر! میں ان پانچ لوگوں کو جانتا ضرور ہوں لیکن میں کئی سالوں سے ان سے رابطے میں نہیں ہوں۔ حتٰی کہ مجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ ملک میں یا ملک سے باہر''

''کوئی بات نہیں اُن سے رابطہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ڈیپارٹمنٹ سے اُنکا موجودہ پتہ اور نمبر فوراً معلوم ہو جائے گا۔ بس خدا کرے کہ وہ سب ملک میں موجود ہوں''

''باقی سب کا تو نہیں پتہ لیکن ان میں سے ایک کو میں نے پچھلے ماہ دیکھا تھا''نوید نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا

''کس کو؟ اور کہاں دیکھا؟''

''عمر۔۔۔ عمر حفیظ نام ہے اُسکا، پچھلے ماہ جب میں اسی کیس کے سلسلے میں ایئرپورٹ گیا تھا تب وہاں دیکھا تھا اُسے، شاید اپنی بیوی اور بیٹی کو رخصت کرنے آیا تھا''

''ہمم۔۔۔ چلو کل تک ہم اُن سب کی معلومات اکھٹی کر کے اُنہیں یہاں بلاتے ہیں تاکہ اس کیس کو آگے بڑھایا جا سکے''

''انشاءاللہ۔۔۔ ٹھیک ہے سر! پھر میں جا رہا ہوں۔''نوید نے اٹھتے ہوئے کہا

''نوید! تُم بھی تو وکٹیم میں شامل ہو۔ تم بتاؤ، تمہیں کسی پر شک ہے؟''انکے سوال پر وہ دوبارہ بیٹھا۔

''میں ایف آئی اے کا سی ٹی ڈی(COUNTER TERRORISM DEPARTMENT)آفیسر ہوں، میرے ہزاروں دشمن ہیں۔ لیکن اسکو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ہم چھ لوگوں کا مشترکہ دشمن ہے۔''

''کون ہو سکتا ہے؟''ڈی جی نے پر سوچ انداز میں کہا۔ بس یہیں آکر وہ اُلجھ جاتے تھے۔ آخر ان سب کے پیچھے تھا کون؟

----------+---------+----------

علی سفیر

عمر حفیظ

مقدم شفیق

رضاالٰہی

حسین مرتضیٰ

نوید عالم

وائٹ بورڈ پر چھ بندوں کے نام لکھے تھے۔ناموں کے نیچے سب کے پرسنل نمبر اور رہائشی پتہ بھی موجود تھا۔فرّخ صاحب نے اُن ناموں کو تین سے چار مرتبہ دہرایا۔پھر شیراز کی جانب متوجہ ہوا

''ان سب سے رابطہ کرو سوائے نوید کے،اور کوشش کرو کہ اصل وجہ بتائے بنا ہی اُنہیں یہاں بلاؤ،ورنہ وہ خوفزدہ ہونگے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں رابطہ کر کے آپکو بتاتا ہوں''اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔وہ جلد از جلد اُن سب کو یہاں جمع کر کے معاملے کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔دیر کرنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔دوسری طرف وہ میکائیل عرف فرمان کی تلاش میں بھی سر گرم تھے، لیکن اُسکا کچھّ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

----------+---------+----------

پیر صبح آٹھ بجے،مورخہ پہلی جنوری:

ایک خوش شکل مرد،اُسکے برابر میں کھڑی خوبصورت عورت اور مرد کی گود میں موجود تین سالہ بچہ، وہ ایک مکمل فیملی فریم تھا۔آج بڑے دنوں بعد اس نے دوبارہ وہ فریم نکالا تھا،دوبارہ خود کو اذیت دی تھی۔ٹوٹا فریم اب اُسکے ہاتھوں میں تھا۔

اس مکمل تصویر کو توڑنے والی وہی خوبصورت عورت تھی، وہی ظالم عورت جس نے اسکی بیٹی اس سے چھینی تھی۔ یہ تو تہہ تھا کہ وہ اسکی زندگی سے جاکر بھی کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اُسے یاد آتی تھی۔ اور اُسکا اچھا بھلا دن خراب کر دیتی تھی۔

عموماً اس وقت وہ آفس میں ہوتا تھا لیکن گزشتہ رات طبیعت کی ناسازی کے باعث اس نے آج آف لیا تھا۔ لیکن کیا فائدہ ہوا؟ آرام کرنے کے بجائے وہ اُسی کو یاد کرنے بیٹھ گیا تھا۔

''اس تو اچھا میں آفس ہی چلا جاتا'' اس نے بیزاری سے سوچا تھا اور اٹھ بیٹھا لیکن وہی فریم پھر نظروں کے سامنے آیا تھا

''آہ فاطمہ! کاش کہ میں تمہاری جان ہی لے سکتا میں؟'' اس نے کرب سے آنکھیں موندی تھیں۔

''کتنی ظالم ہو تم؟ کتنی؟ اور کچھ باقی رہ گیا تھا جو میری اولاد بھی چھین لی مجھ سے؟'' دل چاہا کہ وہ کہیں سے سامنے آجائے اور وہ اُسے جہنّم کے کسی بدترین کونے میں پھینک آئے۔ کتنی دیر وہ سر تھامے بیٹھا رہا تھا۔ اُسکا موبائل چیخ چیخ کر اُسے اطلاع دے رہا تھا کہ کوئی اسے کال کر رہا ہے۔ اس نے دیکھا تو وہ وہاں **پرائیویٹ نمبر** لکھا تھا۔

''پرائیویٹ؟'' وہ حیران ہوا۔ ''یہ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟''

''ہیلو؟'' اس نے موبائل کان سے لگا کر کہا

''علی سفیر بات کر رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا

''جی میں علی سفیر ہی بات کر رہا ہوں۔'' اُسکے بعد دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا تھا اس نے علی کو حیران کم پریشان زیادہ کیا تھا

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا؟'' اس نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔ اُسے اس ہفتے کے آخر تک ایف آئی اے آفس آنے کو کہا جا رہا تھا اور وجہ بھی نہیں بتائی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے لیکن ایسا ہے کہ میں اتوار کو فارغ ہوں اگر آپکو اعتراض نہ ہو تو اسی دن آجاؤں؟'' دوسری طرف سے شاید اجازت دے دی گئی تھی، اس نے شکریہ کہہ کر فون کاٹ دیا تھا۔ انہوں نے اُسے کہا تھا کہ کسی بہت ہی حساس کیس میں اُسے نامزد کیا گیا اور بقیہ باتیں ایف آئی اے آفس آنے پر چھوڑ دی تھیں۔ وہ اُن سے زیادہ بحث بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب شدید پریشان تھا۔ آخر اُسے کیوں بلایا جا رہا تھا؟

----------+---------+----------

پیر صبح ساڑھے نو بجے، مورخہ پہلی جنوری:

''اس دنیا میں ہر شخص آواز کے خوف کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ آپ کسی بھی شخص کے پیچھے جا کر بلکل اچانک سے چیخ پڑے یا اچانک اُسکے کانوں کے پاس جا کر کوئی باجا ہی بجا دیں تو وہ بندہ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اچھل پڑتا ہے۔ یہ اونچی آواز کا خوف ہمارے اندر موجود ہوتا ہے۔ ہم اسے ختم تو نہیں کر سکتے البتہ اس پر قابو ضرور پایا جا سکتا ہے۔'' وہ **وائس فیئر** پر کلاس کو لیکچر دے رہا تھا۔ تب ہی اُسکے موبائل نے بہت زور سے بنا کرنا شروع کیا تھا۔ وہ چونک پڑا۔ **آواز کا خوف** ضروری نہیں کہ آپکو چیخنے یا اچھلنے پر مجبور کرے۔ وہ آپکو چونکا بھی دیتا ہے۔ اس نے روسٹرم پر رکھے اپنے موبائل پر نظر ڈالی

''پرائیویٹ نمبر؟'' وہ شدید حیران ہوا تھا۔ کال اٹھانے سے پہلے ہی کٹ گئی تھی۔

''آپ سب لوگ لیکچر نوٹ کریں میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں'' وہ کلاس سے معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

بلیک جینز پر، بلیک شرٹ پہنے اور اس پر نیوی بلیو کلر کا کیجوال کوٹ ڈالے وہ تیز تیز قدموں سے ٹیچرز روم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ''مجھے کسی حساس ادارے کے نمبر سے فون کیوں آیا ہے؟'' وہ پرائیویٹ نمبر کے مفہوم سے بخوبی واقف تھا اسی لیے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ٹیچرز روم خالی تھا، یقیناً سب اپنی اپنی کلاسز لینے گئے ہوئے تھے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا، کال دوبارہ آ رہی تھی۔ اس بار اس نے اٹھا لی۔

"ہیلو! پروفیسر رضا الٰہی بات کر رہے ہیں؟"

''جی میں بات کر رہا ہوں، کہیئے؟''

''سر! میں اے ایس پی شیراز ہوں ایف آئی اے سے، آپکو ایک کیس کے سلسلے میں آفس آنا ہو گا۔ آپ کب تک آ سکتے ہیں؟''

''کس قسم کا کیس اور مجھے کیوں آنا ہو گا؟''اس نے اپنے لہجے پر کافی حد تک کنڑول کر لیا تھا

''سر! پریشانی کی بات نہیں ہے، بس آپ سے کچھ تفتیش کرنی ہے۔ البتہ کیس کے بارے میں ہم آپکو فون پر نہیں بتا سکتے آپکو یہاں آنا ہو گا۔ جگہ آپکو جلد بتادی جائیگی''

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا''

''تو پھر آپ کب تک آ سکتے ہیں؟''

''ایسا ہے کہ میں اتوار تک آ سکتا ہوں۔ باقی کے دنوں میں مجھے جامعہ میں کلاسز لینی ہوتی ہیں''

''ٹھیک ہے سر! ہم آپکا انتظار کرینگے۔ اتوار کی صبح ۱۰ بجے''

''میں وقت پر پہنچ جاؤں گا''اس نے کال کاٹی، لیکن وہ اُلجھ چکا تھا۔ آخر کس قسم کی پوچھ گچھ کے لیے اُسے بلایا جارہا تھا۔ اور کس کیس میں وہ نامزد تھا اور کیوں؟

----------+---------+----------

پیر صبح گیارہ بجے، مورخہ پہلی جنوری:

آج سال کا پہلا اور ہفتے کا بھی پہلا ہی دن تھا لیکن آج وہ فرم نہیں گیا تھا، چھٹی لینے کے باوجود بھی وہ صبح ہی اٹھ گیا تھا۔ ناشتا کر کے وہ کوئی مارننگ نیوز شو دیکھ رہا تھا کہ مکرّم کے رونے کی آواز نے اُسے متوجہ کیا، وہ یقیناً جاگ گیا تھا اور اپنے جاگنے کی اطلاع رو رو کر دے رہا تھا۔ وہ ریموٹ صوفے پر پھینکتا ہوا کمرے کی جانب بڑھا۔ دو سالہ مکرّم جس نے حالیہ ہی بولنا سیکھا تھا، اُسے دیکھ کر روتے ہوئے ہی ہنس پڑا۔ اُسے اپنے بچے پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ اس نے اسے گود لیا اور اُسکے گال چومے

''اٹھ گیا میرا بچہ۔۔۔ چلو آپکو ناشتہ کرواتے ہیں۔'' وہ اُسے گود میں لیے باہر آیا۔ کچن میں آکر اُسکا دودھ بنایا اور فیڈر میں منتقل کر کے اسے مکرّم کے منہ سے لگایا۔ یہ سارے کام اس نے اُسے گود میں لیے ہوئے ہی کیے تھے۔ پھر اُسے لیکر وہ صوفے پر بیٹھا۔ مکرّم اپنی گول گول آنکھیں کھولے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اسکی گود میں ہی فیڈر پیا کرتا تھا اگر وہ اسے اپنی گود سے تھوڑی دیر کے لیے بھی اتارتا تو وہ اتنا روتا کہ الامان۔۔

وہ پیار سے اُسکے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازے کی بیل بجی، وہ تھوڑا حیران ہوتا ہوا اٹھا۔ مکرّم اسکی گود میں ہی تھا۔ دروازہ کھولا تو باہر بلیک جینز پر بلیک ہی شرٹ پہنے آنکھوں پر گوگلز لگائے کوئی سمارٹ سا لڑکا کھڑا تھا۔

''جی فرمایئے؟''

''میں اے ایس پی شیراز ہوں، ایف آئی اے سے،'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے ہتھیلی پے دھرا اپنا کارڈ اُسکے سامنے کیا۔ وہ سمجھ گیا

''جی اندر آیئے'' اس نے سامنے سے ہٹتے ہوئے اُسے رستہ دیا تو وہ دروازے سے اندر آیا

''آپکا زیادہ وقت نہیں لونگا، اس اتوار کو آپ نے ایف آئی اے آفس آنا ہے۔ ہمارے ڈی آئی جی کو آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں ایک کیس کے سلسلے میں''

''کس قسم کا کیس؟ اور میرا اس سے کیا تعلق ہے''

''آپ کا بہت بڑا تعلق ہے لیکن فلحال میں آپکو کچھ نہیں بتا سکتا مجھے اجازت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے اتوار کو کتنے بجے؟''

"صبح دس بجے، جگہ کے بارے آپکو جلد اطلاع دے دی جائیگی" وہ اُسے ضروری معلومات دے کر چلا گیا۔ مقدم کافی دیر شش و پنج میں کھڑا رہا۔ اس نے اس لڑکے کا ڈیپارٹمنٹ کارڈ دیکھا تھا وہ واقعی ایف آئی اے میں تھا۔ مقدم کے گھر بھی ایسے وقت آیا تھا، جب محلے میں

سب کام پر جا چکے ہوتے ہیں۔اُسکی کالے شیشے والی گاڑی دیکھ کر محلے کے لوگ بھی مشکوک ہو سکتے تھے،اور وہ یقیناً محلے والوں کو اسکی خبر نہیں ہونے دینا چاہتا تھ،ااسی لیے یہ احتیاطی تدابیر استعمال کی تھیں

''یعنی معاملہ کافی گھمبیر ہے؟''اس نے سوچا۔اب جو بھی بات تھی وہ اتوار کو ہی سامنے آنی تھی۔

----------+---------+----------

پیر دوپہر دو بجے، مورخہ پہلی جنوری

''میں اندر آسکتا ہوں؟''

''تُم اندر آچکے ہو''

''سوری سر!''وہ شرمندہ ہوا

''بولو کیا بات ہے؟''

''سر!آفس کے نمبر پر آپ کے لیے کال آئی ہے۔جو بھی ہے اسی وقت آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں''

''ٹھیک ہے، بات کراؤ میری''اس نے مصروف سے انداز میں کہا تو وہ وائرلیس اُسکے پاس ہی لے آیا اور خود باہر چلا گیا۔ علی آج آفس نہیں آیا تھا وہ اکیلا ہی تھا۔

''ہیلو!عمر حفیظ اسپیکنگ''اس نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا اور اگلے ہی لمحے اُسکے چہرے کے تاثرات بدلے تھے

''ایف آئی اے؟''اس نے حیرت سے خود کو کہتے سنا اور جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھا

''جی جی۔۔۔میں سمجھ گیا۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔اتوار کو کتنے بجے؟۔۔۔صحیح ہے میں آجاؤں گا''کال ختم ہونے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر وائرلیس ہاتھ میں لیے بیٹھے رہا۔اُسے بھی اتوار کے دن صبح دس بجے بلایا گیا تھا۔بس اتنا بتایا گیا تھا کہ کسی حساس نوعیت کے کیس کے سلسلے میں اسے تفتیش کیے آنا ہے۔

''مجھ سے آخر کس قسم کی تفتیش کرنی ہے؟'' وہ پریشان سا سوچ رہا تھا لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ تھک کر اس نے سوچنا ہی ترک کر دیا۔ اسی اثنا میں علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا

''السلام علیکم۔۔۔'' اس نے عمر کو سلام کیا اور اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ عمر کو وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا لگا تھا

''تم نے تو کہا تھا کے تم آج آف کر رہے ہو؟'' اس نے علی سے پوچھا

''ہاں! ارادہ تو تھا کہ آج نہ آؤں، لیکن طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی اور گھر میں بھی فارغ ہی تھا تو سوچا کہ آفس ہی چلا آؤں'' اس نے اپنی ٹیبل پر رکھی مختلف فائلوں میں سے ایک اٹھالی

''علی۔۔۔'' عمر نے اسے پکارا تو اس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ لیکن عمر کو سمجھ نہیں آیا کہ بات کیا کرے۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر چپ رہا۔ غالباً وہ تذبذب کا شکار تھا کہ تھوڑی دیر پہلے آنے والی ایف آئی اے کی کال کے بارے میں اسے بتائے یا نہیں؟ معاملہ تھا بھی حساس۔۔۔

''نہیں۔۔ کچھ نہیں''

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' علی بھانپ گیا تھا

''نہیں بس میں تم سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ تم کل اچھے بھلے گئے تھے یہاں سے، پھر طبیعت اچانک خراب کیسے ہو گئی؟'' وہ کہنا کچھ چاہتا تھا کہہ کچھ بیٹھا۔ حالانکہ وہ اس سے کبھی ذاتی سوال نہیں کرتا تھا۔

''کچھ نہیں بس کبھی کبھی بلیڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اب ٹھیک ہے'' اس نے مختصر سے جواب دیا۔

''ہونہہ۔۔'' اس نے جواباً بس اتنا ہی کہا۔ وہ خود بھی بہت اُلجھ گیا تھا۔ لہٰذا مزید کوئی سوال نہیں کیا

----------+---------+----------

ایف آئی اے کے کاؤنٹر ٹیررزم ڈیپارٹمنٹ کے ایک آفس میں اس وقت نوید عالم اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کالی جینز پر ہم رنگ لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی جسکی زپ سینے سے تھوڑا نیچے تک بند تھی، جبکہ کھلی ہوئی زپ سے کالی ٹی شرٹ دکھائی دیتی تھی۔

ہاتھوں میں بال پوائنٹ گھماتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ چہرے کے خدوخال میں نمایاں سختی جھلکتی تھی، جو کہ اُسکی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔ کلموں پر دکھائی دیتے چند سفید بال اُسکی بارعب شخصیت کو مزید گریس فل بناتے تھے۔ یہی ایک آدھ سفید بال اُسکے بے حد سیاہ بالوں اور سلیقے سے تراشی ہوئی ہلکی داڑھی کے درمیان بھی کہیں کہیں دکھتے تھے۔ گہری سیاہ آنکھیں شدید اضطراب کا شکار نظر آتی تھیں، دائیں آنکھ کے کنارے سے لیکر بھوؤں کے کنارے تک بال جتنا باریک مگر ایک انگلی جتنا لمبا، کٹ کا نشان موجود تھا۔ وہ بہت لیئے دیئے رہنے والا، لیکن سحر انگیز شخصیت کا مالک شخص تھا۔ عورتیں تو عورتیں، مرد بھی ایک بار مڑ کر اُسے ضرور دیکھتے اور مرعوب ہوئے بنا نہ رہ پاتے تھے۔

کل پوری رات وہ سو نہ سکا تھا، بار بار دماغ اسی نقطے پر آکر اٹک جاتا کہ کون ہو گا جو ان چھ لوگوں کا قتل کروانے کے لیے پیشہ ور قاتل ہائر کریگا؟ اور کوئی آخر انہیں قتل کرنا ہی کیوں چاہئے گا؟ اور وہ بھی ایک ساتھ ایک ہی دن، جب کہ پچھلے دس سالوں سے اُن میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے رابطے میں نہ تھا، کم از کم نوید کی اپنے بارے میں تو یہی رائے تھی۔

شیراز اُسے بریفنگ دے رہا تھا جسے وہ غائب دماغی سے سن رہا تھا۔

''سر! عمر حفیظ، علی سفیر، رضا الٰہی اور مقدم شفیق کو اس اتوار صبح دس بجے آفس بلا لیا گیا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کے حکم کے مطابق تمام بات اُن سے پوشیدہ رکھی گئی ہے، انہیں یہاں آنے پر ہی مکمل تفصیل سے آگاہ کیا جائے گا'' شیراز کی بات پر وہ چونکا تھا

''یہ تو چار لوگ نہیں ہوئے؟ اور حسین۔۔۔ حسین مرتضیٰ؟ اسکے بارے میں نہیں بتایا تم نے؟''

''ہماری اطلاعات کے مطابق وہ اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیوں پر ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اُن سے ہمارا رابطہ بھی نہیں ہو سکا ،امید کرتے ہیں کہ اتوار سے پہلے پہلے اُن سے رابطہ ہو جائے''

''اوہ۔۔۔ پلیز! اپنی پوری کوشش کرنا کہ اتوار تک وہ بھی ہمارے ساتھ ہو۔ یہ معاملہ بہت سنگین ہے'' اس نے کہا تو شیراز سر ہلاتے ہوئے باہر چلا گیا۔ جبکہ وہ خود کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نظریں سامنے لگے بورڈ پر تھی، جہاں چھ لوگوں کی تصویریں انکے ناموں کے ساتھ لگی تھیں۔ وہ اٹھا اور چلتا ہوا اس بورڈ تک آیا، اور خاموشی سے ایک ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔

کتنا عرصہ ہو گیا تھا اُسے اُن سب کی شکلیں دیکھے ہوئے؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔

"شاید نو سال یا دس سال۔۔؟"

زندگی کے چھ سال ساتھ گزارے تھے اُن سب نے، کبھی نہ سوچا تھا ایک وقت آئیگا جب اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے حال تک سے ناواقف ہو گا؟

بورڈ پر نظر آتی پہلی دو تصاویر کے نیچے **عمر حفیظ** لکھا ہوا تھا۔ ایک تصویر مائیکل عرف فرمان نامی اس مفرور مجرم کی ڈائری سے نکال کر یہاں لگائی گئی تھی جو کہ تقریباً دس سال پہلے کی تھی، جب کہ دوسری تصویر شاید چند ماہ یا سال بھر پہلے کی تھی جو کہ ڈیپارٹمنٹ والوں نے مہیا کی تھی۔ نوید چہرے پڑھنا جانتا تھا، وہ ایک نظر چہرہ دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ کون کس حال میں ہے؟

پچھلے ماہ ہی اس نے عمر کو دیکھا تھا، ایئرپورٹ پر۔۔۔ تب پہلی نظر میں تو اسے وہ پہچان ہی نہ سکا۔ بس اُسکا چہرہ کچھ شناسا سا لگا تھا، تقریباً بھی پانچ منٹ لگے تھے اُسے یہ یاد کرنے میں کہ وہ عمر ہے۔۔۔

''عمر۔۔۔''اس نے زیر لب اُسکا نام دہرایا۔

کتنا پیارا بندہ تھا وہ، ہر دم مسکرانے والا، ہر ایک کا خیال رکھنے والا۔ اُسکی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ اُسکی ذات سے کبھی کسی کا دل نہ دکھے، کبھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اُسکی اسی ادا نے ہمیشہ اُسے ہر دل عزیز بنا کر رکھا تھا۔ اور اب؟

نوید نے اُسکی حالیہ تصویر پر ہاتھ پھیرا، اتنی اُداسی کیوں تھی اُسکے چہرے پر؟ ہر دم مسکراتی آنکھیں اتنی بجھی بجھی کیوں لگتی تھی؟ اس نے وہ دن یاد کرنے کی کوشش کی جب اس نے اُسے ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔ کسی کو نظر آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر نوید کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔۔ دیکھا تھا کہ وہ وہاں سے روتا ہوا گیا ہے۔ پر کیوں؟ اس نے تو کبھی رونا نہیں سیکھا تھا، پھر اب؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اُسکے پاس، وہ دوسری تصویر کی جانب بڑھا۔

مقدم شفیق، کیا انسان تھا وہ بھی۔ نوید مسکرایا۔ پچھلے دس سالوں میں جتنی بار بھی اُسے مقدم بھولے بھٹکے سے یاد آیا تھا، ایک مسکراہٹ ہمیشہ اُسکے چہرے کا احاطہ کر لیتی تھی۔ کتنا زندہ دل شخص تھا وہ، دوستوں کا دوست اور بات بات پر قہقہہ لگانے والا۔ اُسے نہیں یاد کہ اس

نے مقدم کو کبھی برے موڈ میں دیکھا ہو، چاہئے کتنی بھی پریشانی کیوں نہ ہوتی وہ ہمیشہ خود بھی ہنستا مسکراتا رہتا تھا اور دوسروں کو بھی ہنساتا رہتا تھا۔ اُسکی حس مزاح کبھی بھی اُسے خاموش بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ وہ جہاں ہوتا تھا وہ محفل کشت زعفران بن جاتی تھی۔ اور پھر ایک دن وہ اچانک انکی زندگیوں سے نکل گیا تھا، بنا کچھ کہے، بنا کچھ بتائے

اُسے تو وہ مردہ سمجھ بیٹھا تھا، جب فرّخ صاحب نوید سمیت باقی لوگوں کا ڈیٹا لے رہے تھے، تو اس نے سوچا تھا کہ اُن سے کہہ دے کہ مقدم تو شاید مر چکا ہو لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس بات کا فلحال اُسے خود بھی صحیح سے یقین نہ تھا، یہ بس ایک قیاس تھی۔ اور کچھ دیر بعد جب شیراز نے اسے بتایا کہ اُن پانچ لوگ کا پتہ معلوم ہو گیا ہے تو اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ مقدم اسی شہر میں تھا؟ زندہ تھا؟ اتنی بڑی فرم کا اکیلا مالک تھا؟ پھر انکی نظروں سے اوجھل کیوں تھا؟ اگر وہ زندہ تھا تو اتنے عرصے سے کہاں غائب تھا؟ نوید نے ایک نظر اُسکی نئی تصویر پر ڈالی، ایک کامیاب بزنس مین جتنی ساری خوبیاں دکھتی تھیں اس میں، لیکن اُسکی وہ زندہ دل ہنسی؟ وہ کہاں گئی تھی؟ وہ ہر دم شرارت پے آمادہ آنکھیں، اتنی سنجیدہ کیسے ہو گئی تھیں؟ کوئی جواب نہ تھا اُسکے پاس، وہ تیسری تصویر کی جانب بڑھا

رضاالٰہی، تیسرے نمبر کی دونوں تصاویر رضا کی تھیں۔ اپنی پرانی تصویر میں بھی وہ خاموش طبع لڑکا تھا، اپنے آپ میں کھویا ہوا، چپ چپ سا ۔۔۔ گم سم سا۔۔۔ اپنے سے خول میں بند رہنے والا۔ اُسکا مزاج ہی ایسا تھا شاید، وہ بولنے سے زیادہ سننے پر توجہ دیتا تھا، وہ ایک اچھا سامع تھا۔ قسمت اس پر مہربان تھی۔ وہ جو کام کرتا تھا اس میں کامیاب ضرور ہوتا تھا۔ وہ کم گو ضرور تھا لیکن اُسکے چہرے پر ایک اُداس سی مسکراہٹ ہمیشہ رہتی تھی۔ جو دیکھنے والوں کو اُسکا گرویدہ بناتی تھی۔

نوید نے اُسکی حالیہ تصویر کا بغور جائزہ لیا، انتہا کی سنجیدگی تھی اُسکے چہرے پر، اور اُسکی وہ بھلی سی اُداس مسکان وہ تو کہیں تھی ہی نہیں، ایسا لگتا تھا جیسے اس چہرے سے جینے کی امید ہی ختم ہو گئی ہو۔ پہلے تو وہ گم سم سا رہتا تھا لیکن اب، اب تو موت جیسا سنّاٹا تھا اُسکی آنکھوں میں، کیا وہ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا؟

وہ اسی خاموشی سے اگلی تصویر کی جانب بڑھا۔

علی سفیر، دو تصاویر وہاں بھی تھیں، اس تصویر پر اسے غور کرنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ گئے وقتوں نے اگر کسی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا تھا، تو وہ علی تھا۔ وہ جذباتی تھا، بہت جلدی برہم ہو جایا کرتا تھا، غصّہ بھی ہر وقت ناک پر دھرا رہتا تھا اُسکے، نوید یاد کر کے مسکرایا۔ وہ مزاج

کا تیز ضرور تھا لیکن دل کا برا نہ تھا، وہ صاف گو تھا۔ ہمیشہ سچ بولتا تھا اور سچ ہی سننا پسند کرتا تھا۔ جتنے جلدی روٹھتا تھا اتنے جلدی مان بھی تو جایا کرتا تھا۔ نوید کہتا تھا کہ علی اُسکا ہی ایک حصہ ہے، اگر نوید کے سب سے زیادہ قریب کوئی تھا، تو وہ یہی تھا، علی۔۔۔ اسے یاد تھا جس دن اُسکی شادی تھی۔ کتنا خوش تھا وہ جیسے اب تا عمر یونہی خوش رہے گا۔ لیکن۔۔۔

یہ چٹانوں جیسی سختی کہاں سے آگئی تھی اس میں ؟ نوید نے غور سے اُسکی تصویر کو دیکھا، وہ اُسکا علی تو نہ تھا۔ وہ تیز مزاج تھا لیکن سخت مزاج تو کبھی نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ کوئی ایسا جسکا دنیا پر سے اعتبار آٹھ چکا تھا، کوئی ایسا جس کو انسانوں سے ہی نفرت ہو گئی ہو، کوئی ایسا جو زندگی جی رہا ہو نہ گزار رہا ہو، بلکہ اُسے گھسیٹ رہا ہو۔ بس اُسکے ختم ہونے کے انتظار میں ہو۔ کون تھا یہ ؟ وہ مزید اُسکے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے آگے کی تصاویر کی طرف بڑھا۔

حسین مرتضیٰ، اُسکی دونوں تصاویر میں اگر کوئی فرق تھا تو بس اتنا کہ پچھلی تصویر میں وہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور اس تصویر میں ایک بھرپور مرد۔ بس عمروں کا فرق تھا۔ گزرے وقت نے اس پر اگر کوئی اثر ڈالا تھا تو بس اتنا ہی۔ نوید کے دل میں ایک انہونی سی خوشی نے سر اٹھایا۔ کوئی تو تھا جو ویسا ہی تھا۔ نوید نے اُسکی پرانی اور نئی تصویر کا آپس میں موازنہ کیا، چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ روزِ اوّل کی طرح موجود تھی، زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی، اور وہ آج بھی وہیں تھیں، ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر گڑھے پڑتے تھے، وہ ہنسی آج بھی اتنی ہی معصوم تھی۔ وہ سکون سے بیٹھنے والا انسان نہیں تھا، دن بھر میں چلتے پھرتے کسی نہ کسی کو چھیڑنا، کسی بھی طرح اپنے آس پاس کے لوگوں کو تنگ کرنا اُسکا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اُسکی بے ضرر سی شرارتیں سامنے والے کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتی تھی۔ کتنی بار نوید جیسا چالاک بندہ بھی اُسکے ہاتھوں بیوقوف بنا تھا۔ وہ مسکرا دیا، یادوں کا خزانہ اُبل اُبل کر باہر آنے کو تیار تھا۔

کیا آج بھی وہ ویسا ہی ہے ؟ نوید نے بغور اُسکی تصویر کو دیکھا۔ دل سے صدا آئی، ہاں ! ! وہی تو تھا جسے دیکھ کر زندگی کا احساس ہوتا تھا، ان اُداس چہروں میں ایک اسی کا چہرہ تھا جو آج بھی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔ لیکن جب وہ یہاں آئیگا اور اسے پتہ چلے گا کہ چھ ماہ بعد اسے قتل کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی ہے تو کیا وہ اسی طرح مسکرا اسکے گا ؟ کیا وہ اُسے بتا پائے گا کہ وہ کس پُل صراط پر کھڑے ہیں ؟ کیسے کہے گا وہ اُسے ؟ اس چہرے کو اُداس کرنے کی طاقت تھی اس میں، یقیناً نہیں۔

آخری دو تصاویر پر نظر ڈالنے کی اس نے زحمت بھی نہ کی تھی، وہ اُسکی اپنی تصویریں تھیں۔ اپنے بارے میں تو جیسے اب وہ بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جیسے خود سے نفرت کی آخری منزلوں پر تھا۔ اپنی ہی تصویروں سے نظریں چرا کر، بوجھل قدموں سے دوبارہ اپنی کرسی پر سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ یادوں کا یہی تو مسئلہ ہے، جب آتی ہیں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اُسکی ڈیوٹی بدلنے کا وقت ہو چکا تھا لیکن اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ماضی تھا کہ دل کے صندوقوں سے باہر آنے کو بیتاب، لیکن اس نے بھی قفل لگا کر کسی اور وقت کے لیے بند کر دیا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اسی وقت ڈیوٹی پر مامور دوسرا افسر وہاں آیا تو وہ جیسے ہوش میں آیا

''ارے! تم گئے نہیں اب تک؟'' آنے والے نے حیرت سے پوچھا

''نہیں کچھ کام تھا بس اب نکل ہی رہا ہوں'' وہ اٹھ کر سامان سمیٹنے لگا آنے والے نے بس سر ہلا دیا، اُسکے بعد انکے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور نوید اپنا ضروری سامان لیے وہاں سے نکل گیا۔

----------+---------+----------

''میرا جنازہ رات کے وقت نکالنا، تاکہ کی نامحرم کی نظریں نہ پڑیں'' (خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا)

وہ بار بار یہ ایک جملہ پڑھے جا رہی تھی۔ آنسوں تواتر سے اُسکی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ جسم پر کپکپی طاری تھی۔

''یارب۔۔۔'' وہ سسکی

''یاتواب'' وہ تڑپ تڑپ کر روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

''میرا نام جس عظیم ہستی کہ نام پر رکھا گیا تھا، میں نے۔۔۔ میں نے تو اُن کے نام کی لاج بھی نہ رکھی۔'' وہ رو رو کر کہہ رہی تھی

''میں کیا کروں گی؟ کیا کروں گی اگر محشر میں، میری سردار نے مجھ سے پوچھ لیا کہ فاطمہ! کیا میرے نام کی تمہارے نزدیک اتنی سو وقعت نہ تھی۔ اتنی سی بھی۔۔۔ کہ تم میری وصیت سے ہی کوئی نصیحت حاصل کرتی؟'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''میں کیسے سامنا کروں گی اُنکا؟ جب وہ مجھ سے پوچھیں گی کہ کیا میرے بابا ﷺ کا دین اتنا مشکل تھا؟ اتنا کہ تم کچھ دیر کو بھی صبر نہ کر سکی؟ کہ تم محرم اور نامحرم کی تمیز بھول گئی؟ میں کیا جواب دونگی؟ کیا جواب دونگی انکو؟'' رات کے اس پھر فاطمہ آفندی خود احتسابی کی کڑی منزلیں تہہ کر رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ کوئی اُسکی چھپ کر دیکھ رہا تھا

----------+---------+----------

پاؤ پھوٹنے سے چند لمحوں پہلے جب سب مخلوق خدا سو رہی ہوتی ہے، اور ساری رات درد سے کراہتے مریض کو بھی اس پل نیند آ ہی جاتی ہے۔ ایسے میں اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل پر ایک بہت پرانی سی ڈائری کھولے وہ بیٹھا تھا۔ وہ جسکی آنکھوں سے نیند برسوں ہوئے، دور ہو چکی تھی۔ وہ جو رات کے اس پہر جاگ کر اپنے زندہ ہونے کا ماتم منایا کرتا تھا۔ وہ جو یادوں کے سمندر پر بند باندھنے کی کوششوں میں ہمیشہ ناکام رہتا تھا۔

وہ ڈائری کے صفحے آہستہ آہستہ پلٹ رہا تھا۔ ہر صفحے پر مختلف شاعری لکھی ہوئی تھی۔ بہت سارے صفحے آگے بڑھانے کے بعد وہ ایک صفحے پر آکر رکا۔ وہاں پر پنسل اور براؤن رنگ کے پوائنٹر پین سے ایک غزل نقل کی گئی تھی۔ وہ لکھائی اُسکی نہیں تھی، اُسکے کسی بہت پیارے کی تھی۔ وہ لفظوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

رنجش ہی سہی، دل ہی دُکھانے کے لیے آ

آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

اپنے کمرے میں علی وہی فریم ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا جس نے اُسکا آج کا پورا دن خراب کیا تھا۔ لیکن شاید اُسے شوق تھا خود کی اذیت دینے کا، وہ بار بار اس ٹوٹی ہوئی تصویر کو نکال کر دیکھتا تھا۔ اور ہر بار نئے سرے سے اپنے زخموں کو تازہ کر دیتا تھا۔ اُسکا بیٹا کب کا سو چکا تھا لیکن اُسے کہاں اب نیند آنی تھی۔

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو

رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

رضا گھر میں داخل ہوا تو روز کی طرح آج بھی سنّاٹوں نے اُسکا استقبال کیا تھا۔ انہی سناٹوں سے اُسے وحشت ہونے لگتی تھی، وہ گھر نہیں آنا چاہتا تو بھی اسے آنا پڑتا کہ یہاں نہ آتا تو کہاں جاتا؟ وہ دنیا میں کہیں بھی چلا جاتا حقیقت تو یہی تھی کہ وہ اس بھری دنیا میں تنہا تھا۔ وہ مر گیا تو اُسکا جنازہ اٹھانے والا بھی شاید کوئی نہ ہو۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم

تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

سارا آفس خالی ہو چکا تھا، لیکن عمر اب تک گھر نہیں گیا تھا۔ کیسے جاتا وہ؟ گھر میں اُسکا انتظار کرتی عمائمہ اب نہیں تھی۔ وہ جو اُسے دیکھ کر بھاگتے ہوئے آتی تھی اور اُسکی گود میں چڑھ جاتی تھی۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اُسے دن بھر کی روداد سناتی تھی لیکن اُسے بھی اُسکی ماں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ عمر کی پہنچ سے بہت دور۔ اور اپنے خود کے ماں باپ کی نظر میں تو وہ بہت پہلے ہی نافرمان ٹھہرایا جا چکا تھا۔ ایک عمائمہ ہی تو تھی جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اور اب وہ بھی کہیں نہیں تھی۔

جیسے تُجھے آتے ہیں نہ آنے کے بہانے

ایسے ہی کسی روز نہ جانے کے لیے آ

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پوری گلی سنسان پڑی تھی، ایسے میں تیز تیز قدم اٹھاتا نوید، قبرستان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ قبرستان میں داخل ہو کر وہ اپنی مطلوبہ قبر کے پاس پہنچا۔ اُسکی امید کے مطابق وہ وہیں تھیں۔ اس گُھپ اندھیرے میں بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ قبر پر سر رکھے کچھ گنگنا رہی ہے۔ وہ گہری سانس لیتا خود کو اس سے بحث کے لیے تیار کرنے لگا، جو اُسے گھر واپس لے جانے کے لیے اسی سے کرنا تھی۔

اب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں

یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

(احمد فراز)

مقدم نے ڈائری کے صفحے الٹے پلٹنے شروع کر دیے اور سب سے پہلے صفحے پر پہنچ گیا۔ وہاں خوبصورت رنگوں کے مارکر سے بڑا بڑا لکھا تھا **لیلیٰ مقدم**۔۔۔اس نے تین سے چار بار اس نام کو پڑھا۔ پھر گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی

----------+---------+----------

(جاری ہے)

اگلی قسط آپ انشاءاللہ جولائی کی پندرہ تاریخ کو پڑھ سکے گے۔ قسط میری ویبسائٹ اور آفیشل فیس بک پیج پر شائع کی جائیگی۔